شعورِ نبوّت

از

سیّد نذیر نیازی

۱۹۷۸ء

شعورِ نبوّت

جزوِ اوّل

صوفیہ کا دعویٰ ہے کہ ان کے احوال و واردات میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب ان کی ذات سے باہر، بایں ہمہ اِس پر محیط ایک فرید و وحید اور یکتا ہستی سے براہِ راست تقرب و اتصال میں ان کی اپنی ہستی کالعدم ہو جاتی ہے۔ زمانے کا جیسا کہ معمولاً ہمارا اِس سے گذر ہوتا ہے یعنی اِس زمانے کا جس کا خاصہ ہے مرور، جس میں ماضی، حال اور استقبال کا امتیاز ناگزیر ہے، اصطلاحاً زمان قار، یا زمانِ متسلسل کا احساس باقی نہیں رہتا۔ زمان و مکان کی دنیا سے ان کا رشتہ کٹ جاتا ہے۔ لیکن یہ لمحہ بہرحال لمحہ ہے۔ آیا اور گذر گیا۔ صوفی روزمرہ کی اِس دنیا میں جس سے بظاہر اسے دستکاری مل گئی تھی پھر واپس آجاتا ہے۔ اس کا شعور ذات لوٹ آتا ہے۔ اب اِس لمحے کو جس میں صوفی کا اتصال ایک فرید و وحید ہستی، بالفاظِ دیگر ذاتِ الٰہیہ سے ہوا، اتحادِ ذات، سے تعبیر کیا جائے اور اِس سے انقطاع کو "بازآمد" سے تو سوال پیدا ہوگا کہ اگر صوفی کا یہ حال، یا تجربہ اور مشاہدہ، یا جیسی بھی کوئی اصطلاح اختیار کی جائے فریب اور واہمہ نہیں نہ کوئی اعصابی، یا نفسیاتی عارضہ اِس کی علت۔ نہ دماغی یا جسمانی خرابی اِس کا سبب۔ نہ صوفی کی داخلی کیفیت کا کرشمہ۔ بلکہ ایسا ہی حقیقی اور واقعی جیسے حواس کی مدد سے ہمارے معمول کے تجربات، اقبال کی اصطلاح میں محسوسات و مدرکات، تو کیا اِس کا کچھ حاصل بھی ہے؟ ہمارے لئے کوئی معنی بھی؟ اقبال نے یہ سوال اس لیے اٹھایا ہے کہ انہیں صوفیہ کے احوال و واردات کی صداقت کا اعتراف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں صوفیہ کے تجربات و مشاہدات اور ہمارے معمول کے تجربات اور مشاہدات میں جہاں تک کسی حقیقت کے ادراک کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں۔ برعکس اِس کے وہ بھی شعور کا ویسا ہی تار و پود ہیں جیسے طبعی مرتبے میں محسوسات و مدرکات اِس کا سرچشمہ۔ لہٰذا ویسے ہی علم کا ایک یقینی اور قابلِ اعتماد ذریعہ۔ اقبال کی رائے میں شعور کی جو دنیا اِس طرح متشکل ہوتی ہے۔ ہم اِس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کر سکتے۔ البتہ ہمیں چاہیئے اِس کی ماہیّت اور نوعیت پر نظر رکھیں۔ بتقاضائے علم ہی نہیں، زندگی کا مفاد بھی اِس امر کا مقتضی ہے کہ شعور کی اِس مخصوص دنیا سے جو نتائج مترتّب ہوتے ہیں ان کے نقد و مطالعہ کا عمل جاری رہے۔ مبادا ہم کوئی ایسا نتیجہ قبول کر لیں جو ہمیں کسی غلط راستے پر ڈال دے۔ علم شعور ہی کی منظم شکل کا دوسرا نام ہے۔ اس کا وظیفہ یہ ہے کہ زندگی میں آسانی پیدا کرے۔ یہ نہیں کہ کاروبارِ حیات مشکلوں میں الجھ جائے۔ ہمیں چاہیئے علم کی جو بھی شکل ہے اِس کے رد و قبول میں احتیاط سے کام لیں۔ اس کی تطہیر و تہذیب کا عمل جاری رکھیں۔

اب جہاں تک صوفی کے شعور، اصطلاحاً شعورِ ولایت کا تعلق ہے اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ یوں شعورِ نبوت کو شعورِ ولایت سے جو نسبت ہے باعتبار اس کے یا یوں کہیئے شعورِ ولایت کی رعایت سے شعورِ نبوت کا فہم آسان ہو جائے گا۔ اب یہ تو معلوم ہے کہ شعورِ نبوت اور شعورِ ولایت کا سرچشمہ وہ احوال و واردات ہیں جن کو روحانی یا باطنی کہا جاتا ہے۔ اِن معنوں میں کہ ان کا تعلق غور و فکر کی دنیا سے ہوگا، نہ مدرکاتِ حواس سے جو معمولاً ہمارے تجربات اور مشاہدات کا سرچشمہ ہیں۔ ہم ان مشاہدات اور تجربات کی طرح ان کا ابلاغ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مشاہدات سرتاسر سرنجی ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ ہر کسی کے اپنے احوال ہیں۔ بقولِ شاعر

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی

برعکس اس کے انبیاء علیہم السّلام کی واردات اتحاد سے شعور کی جو دنیا متشکل ہوتی ہے اِسے وحی و تنزیل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور وحی و تنزیل نوعِ انسانی کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ان تعلیمات کا سرچشمہ جن کا ابلاغ ان کا فرضِ منصبی ٹھہرا۔ لیکن صوفیہ کی واردات اتحاد کی نوعیت یہ تو نہ ہوتی۔ الا یہ کہ مشاہدہ حق کی صورت میں وہ اپنے احوال و واردات سے پردہ اٹھائیں، ان کی حقیقت بیان کرتے رہیں۔ صوفیہ کی ایک ہی آرزو ہے اور وہ ذاتِ الٰہیہ سے قرب و اتصال۔ یہی ان کی انتہائے طلب، لہٰذا دلی خواہش کہ اتحادِ ذات کا لمحہ جاودانی ہو جائے۔ زمانے کی رو آگے نہ بڑھے۔ مرورِ وقت کا احساس جاتا رہے۔ صوفیہ کی نظر میں مجاز حقیقت کا پرتو ہے۔ وہ اس لمحے کی جذباتی شدت اور اس کے سرور و مستی کو زندگی کے اِن احوال اور جذبات و احساسات کی رعایت ہی سے بیان کر سکتے ہیں۔ جن کا تھوڑا بہت تجربہ ہر شخص کو ہوتا اور ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً عشق و محبت کی دنیا میں عجز و نیاز کی کیفیتیں، یا ہجر و وصال کی ساعتیں۔ بُلھے شاہ کہتے ہیں۔

اج پی گھر آئیو لال نیں	گھڑیال دیو نکال نیں
گھڑی گھڑی گھڑیال بجاوے	رین وصل دی پیا نیں گھٹاوے
من میرے دی بات جو پاوے	ہتھوں چاسٹے گھڑیال نیں

ظاہر ہے جب لال پی گھر آیا تو کس کا جی نہیں چاہے گا کہ وصل کی یہ ساعت جاودانی ہو جائے۔ گھڑیال مرورِ وقت کی علامت ہے۔ وقت گذر رہا ہے۔ وقت نہ گذرے۔ بازآمد کی نوبت نہ آئے۔ وقت ہی صوفی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وقت کی زنجیر کیسے ٹوٹے۔ شاید موت اس زنجیر کو توڑ ڈالے۔ فراق وصل سے بدل جائے۔ آسی سکندرپوری کا شعر ہے۔

فراق و وصل کے جھگڑوں میں ڈالا مجھ کو ظالم نے
غبارِ ہستی و ہمی جو اُڑ جائے تو بہتر ہو

گویا صوفی کی دنیا صرف اتحادِ ذات کی دنیا ہے۔ باقی سب ہیچ، اس کیلئے کائنات کوئی معمہ ہے نہ عالمِ فطرت میں

اِس کے لئے کوئی کشش، نہ تاریخ کے بدلتے ہوئے احوال وشئون، نہ مصاف حیات کی کشاکش سے کوئی دلچسپی۔ اِلّا یہ کہ جس ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے اس میں مجاز کا رشتہ حقیقت سے قائم رہے، خواہ یہ زندگی کے تقاضے ہوں یا سیاست اور معاش کے بکھیڑے۔ علم وحکمت کی طلب ہو، ادب وفن کا ذوق، یا مذہب وملت کی تفریقات صوفی کو ان سے کوئی اصلاً تعلق نہیں۔ ہے تو ضمناً یا ثانیاً اور وُہ بھی جس حد تک ایک خالصاً انسانی اور اخلاقی نقطہ نظر سے اس کے ایمان ویقین، یا مسلک ومشرب کا تقاضا ہے۔ دراصل صوفی کی نظر میں حیات چند روزہ ایک سفر ہے مجاز سے حقیقت کی طرف۔ اس سفر کی کئی منزلیں ہیں۔ کئی مقام۔ اس کی غایت طلب ہے اتحادِ ذات اور اتحادِ ذات وہ مقام جہاں پہنچ کر اس کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اس سفر سے کیوں واپس آئے۔ اس نے حقیقت کو پالیا گوہرِ مقصود ہاتھ آگیا۔ لیکن وہ اس سے واپس آجاتا ہے۔ اسے واپس آنا پڑتا ہے۔ واپس آتا ہے تو اس تجربے اور مشاہدے کی کیفیت کا اظہار جس میں اس کا اتصال ایک حقیقت سرمدی سے ہوا نہ صرف یقین اور علم الیقین کی منزلوں سے گذرتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں بیان کرے گا۔ دعوت دے گا ہم بھی اس حقیقت سرمدی، اس ایک ہستی سے قریب ہونے کی کوشش کریں جس کے سوا اور کوئی ہستی نہیں، جو سرتاسر حق ہے۔ سرتاسر رحمت اور محبت۔ جس کا قرب دل وجان کی راحت ہے۔ کیف وسرور، مسرت وابتہاج کا ایک لازوال سرچشمہ۔ یہ قرب واتصال وہم نہیں، حقیقت ہے۔ دیوان شمس تبریز کی ایک غزل ہے۔

باز آمدم باز آمدم از پیش آں یار آمدم
بر من نگر بر من نگر بہر تو غم خوار آمدم
مارا بچشم دل ببیں مارا بچشم سر مبیں
کاخر صدف من نیستم من درِ شہوار آمدم

رومی کے احوال وواردات کا معاملہ اگرچہ اپنی جگہ پر منفرد ہے لیکن اِن اشعار سے صوفی کے قلب ونظر کا اندازہ نہایت خوبی سے ہو جاتا ہے۔ صوفی حقیقت بہ کنار ہے۔ اس نے وہ راز پالیا جس کے ہم سب جویا ہیں۔ اس ہستی سے تقرب حاصل ہو گیا جو اول وآخر بھی ہے ظاہر اور باطن بھی، جو حواس کی گرفت میں نہیں آتی، جس کے ادراک کا بجز ان احوال و واردات کے جن پر صوفیہ زور دیتے ہیں کوئی راستہ نہیں، ہے تو عقیدہ یا استدلال۔ لیکن عقیدہ کیسا بھی مضبوط ہو ناممکن ہے علم کا سرچشمہ بن سکے۔ رہا استدلال سو استدلال کے پاؤں چوبین ہوتے ہیں اور "پائے چوبین سخت بے تمکین" یہی وجہ ہے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں اس سوال کے پیش نظر کہ حقیقت مطلقہ تک کیا عقل کی رسائی ممکن ہے اقبال نے خطبات کا آغاز صوفیہ کے احوال وواردات سے کیا۔ اس لئے کہ ان احوال وواردات میں بھی تعقل کا ایک عنصر شامل رہتا ہے۔

لیکن صوفیہ کی وارداتِ اتحاد سے شعور کا جو عالم متشکل ہوتا ہے ہم اس کا مقابلہ شعور کے کسی مرتبے سے

جو عالم متشکل ہوتا ہے ہم اس کا مقابلہ شعور کے کسی دوسرے مرتبے سے تو نہیں کر سکتے۔ مثلاً فلاسفی یا سائنس دان کے شعور سے۔ اِس لئے کہ ان کے شعور کا سرچشمہ ہے ادراک بالحواس، عقل اور فکر۔ رہا شاعر کا وجدان سو اس طرح شعور کی جو شکل متشکل ہوتی ہے اس کی نوعیت جذباتی ہوگی اور بسبب استعارات و کنایات بڑی حد تک مبہم اور غیر واضح۔ البتہ ایک اور شعور ہے، یعنی شعورِ نبوت جس سے اس کا مقابلہ ممکن ہے کیونکہ دونوں میں ایک صوری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ شعورِ نبوت کا سرچشمہ بھی وہ روحانی تجربات اور مشاہدات ہیں۔ جن کا رشتہ ہم عقل اور فکر سے جوڑ سکتے ہیں، نہ مدرکات حواس سے۔ ان کا سرچشمہ ہے انبیا علیہم السّلام کا ضمیر اور باطن، یا جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے قلب۔ لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انبیاؑ اور صوفیہ کے روحانی مشاہدات اصلاً ایک ہیں۔ فرق صرف مراتب کا ہے ہرگز نہیں۔ صوفیہ اور انبیاء کا گذر واردات اتحاد سے ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں ان کی بازآمد یقینی ہے۔ لیکن اس صوری مماثلت سے جس غلط نفسیات کو تحریک ہوئی اس کا کوئی جواز نہیں۔ کہا گیا ہے کہ نبوّت روحانیت کا ایک مقام ہے۔ ولایت بھی ایک مقام۔ نبوّت اور ولایت میں فرق ہے تو یہ کہ اس مقام میں انبیا علیہم السّلام کا تعلق خالق اور مخلوق دونوں سے قائم رہتا ہے۔ صوفیہ کا صرف خالق سے جیسا کہ شہیدی نے حضور رحمۃ للعالمین کی شان میں کہا ہے۔

ادھر مخلوق بھی شامل ادھر اللہ سے واصل
خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرف مشدد کا

حالانکہ نبوت کو باصطلاح تصوّف اگر روحانیت کے ایک مقام سے تعبیر کیا جائے جب بھی وہ اپنی مثال آپ، ایک یکتا اور ناقابل تقسیم وحدت ہے یہ کہنا کہ اس کے دو جزو ہیں غلطی ہے۔ قرآن مجید سے اس کی کوئی سند ملتی ہے، نہ از روئے نفسیات اس کا کوئی جواز ہے۔ تصوّف کی اصطلاح ہی میں گفتگو کی جاتی تو یہ کہنا چاہیئے، کہ ولایت اور نبوّت گو بظاہر روحانیت کے مقام ہیں لیکن باعتبار نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ میری رائے میں تو نبوت اور ولایت کے بارے میں یہ طریقِ گفتگو ہی سرے سے غلط ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نبوت اور ولایت میں قدر مشترک کیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ نبوّت کی بدولت جس حق کا انکشاف ہوتا ہے کیا ہم اپنے طور پر بقدر استطاعت خود بھی اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ گویا بالفاظ اقبالؒ یہ مسئلہ علم کا ہے کہ بلا اتصال بھی کیا اس حقیقت سرمدی سے ممکن ہے جس کا تقرب انبیا علیہم السلام کو حاصل تھا اور جس کی انہوں نے ہمیں خبر دی۔ چنانچہ یہ جو اقبال نے خطبات میں کہا ہے کہ شعورِ ولایت اور شعورِ نبوّت میں صفاتاً کوئی فرق نہیں تو ان معنوں میں کہ شعور کی اِن صورتوں میں ادراک بالحواس کو مطلق دخل نہیں ہوتا اور جس کے آگے چل کر انہیں یہ کہہ کر خود بھی وضاحت کرنا پڑی کہ باعتبار نوعیت شعور کے یہ دونوں مراتب ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ دراصل تعلق باللہ اور تعلق بالناس کا امتیاز ہی سرے سے غلط ہے۔ اس لئے کہ از روئے نفسیات یہ ایک ہی تعلق کے دو رُخ ہیں۔ تعلق باللہ اِس قسم کی حد بندیوں سے آزاد ہے جس کی طرف صوفیاء اشارہ کرتے ہیں۔

نتیجہ اس غلط نفسیات کا یہ ہوا کہ جیسے جیسے صوفیانہ غور و فکر نے بے راہروی اور بے اعتدالی اختیار کی۔ جیسے جیسے بسبب زوال تصوف جس سے مقصود تھا احوالِ حیات میں شریعت کی دید اور شریعت ان حقائق کے اعتراف و احترام کا دوسرا نام جن کے سہارے زندگی کا رُخ صحت کے ساتھ متعین ہو جاتا، اس کی حرکت قائم اور برقرار رہتی ہے۔ لیکن جونہی تصوف اپنے مقام سے ہٹ کر منطقی استدلال اور قیاس آرائیوں اُلجھ گیا نبوّت کی حقیقت اوجھل ہوتی چلی گئی۔ حالانکہ تصوف ہی کی اصطلاح میں گفتگو کریں جب بھی کہنا پڑتا ہے کہ انبیاؑ علیہم السّلام کی وارداتِ اتحاد اور صوفیہ کی وارداتِ اتحاد اصلاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں باہم کوئی نسبت ہے، نہ مماثلت۔ جب ہی تو صوفیہ کو مقام نبوّت اور مقام ولایت میں امتیاز کرنا پڑا۔ یہ امتیازیوں بھی سمجھ میں آجائے گا کہ انبیاؑ علیہم السّلام کے یہاں صوفیہ کی طرح سیر و سلوک کی اصطلاحیں ہیں نہ سفر و حضر، نہ احوالِ مقامات کی۔ نہ باطن اور ظاہر کا امتیاز، نہ علم و عرفان کی دوئی، نہ فوق الادراک اور غیر فوق الادراک حقائق کا فرق۔ نہ شریعت اور طریقت کی گفتگو، نہ محو و سکر، نہ قبض و بسط کی حالتیں۔ انبیا علیہم السّلام کے ہاں شطحیات ہیں، نہ اسرار و رموز۔ جو بات ہے واضح، قطعی اور حتمی۔ مانا کہ تصوّف کو ایک علمی اور عقلی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ بلکہ پیش کرنا پڑتا ہے تو ان اصطلاحات کی تھوڑی بہت وجہ جواز نکل آتی ہے۔ بایں ہمہ اکابر صوفیہ نے اس باب میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ یوں شریعت کے خلاف کوئی پہلو نکل سکے۔ یا نبوّت کی عظمت میں فرق آجائے۔ بات یہ ہے کہ صوفی کے احوال و واردات تو صرف اتحادِ ذات کا ایک لمحہ ہیں۔ لیکن انبیاء کے لئے ایک فیصلہ کن ساعت اور ایک ایسی بنیادی تبدیلی جس میں اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک وہ عمل بھی ہے جسے اصطلاحاً "حیاتی" ہی کہا جائے گا۔ جس میں بے محنت عقل و ایمان و یقین کی وہ دولت میسّر آتی ہے جس سے ہماری زندگی یک قلم بدل جاتی ہے۔ انبیاؑ علیہم السلام ایک پیغام ایک دعوت اور ہدایت لے کر آتے ہیں۔ اُنہیں ایک منصب عطا ہوتا ہے۔ ایک حکم ملتا ہے۔ وہ اس حکم کو بنی نوع انسان تک پہنچاتے، زندگی کو اس راستے پر ڈال دیتے ہیں جس کی بالقوہ وہ آرزومند ہے۔ بلکہ خود اس کی مثال اور نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ بقول اقبال "نبوّت شعورِ ولایت بشرطیکہ لفظ ولایت سے کوئی غلط فہمی نہ ہو روحانی مشاہدات کی وہ شکل ہے جس میں وارداتِ اتحاد اپنی حدود سے تجاوز کر جاتی اور ان قوتوں کی پھر سے راہنمائی یا از سرِ نو تشکیل کے وسائل تلاش کرتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ انبیاؑ کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب کر ایک تازہ قوت کے ساتھ اُبھرتا اور ماضی کو سرے سے ملیامیٹ کرتے ہوئے زندگی کی نئی نئی راہیں کھول دیتا ہے" کس قدر مختلف ہیں انبیاؑ علیہم السلام کی وارداتِ اتحاد صوفیا کی وارداتِ اتحاد سے جن میں ان کی ہستی کا لعدم ہو جاتی ہے برعکس اس کے انبیاء علیہم السّلام کے لئے یہی واردات اسباب ذات علی ہذا اس شعور کا ایک قطعی اور یقینی لمحہ کہ ان کی ہستی کا حقیقی سرچشمہ کیا ہے۔ ان کی ہستی وارداتِ اتحاد میں کالعدم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے تمام تر احساس کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ کیا خوب کہا ہے ایک صوفی شاعر نے حضور رحمۃ للعالمین کی شان میں:۔

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ جمال　　تو عین ذات را نگری در تبسمی

حقیقت کا سامنا آسان نہیں بہت کم طبائع اس کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ ان احوال اور واقعات پر نظر رکھیئے جن سے بنی نوع انسانی کا گذر ہوا عقلاً فکراً سیاسی، اجتماعی، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے۔ جن کے زیر اثر تہذیب و تمدن نے جو شکلیں اختیار کیں زندگی نے جو رُخ بدلے سب اس بات کا ناقابل انکار ثبوت کہ بہت کم افراد نے عین اس وقت جب حقیقت ان پر منکشف ہو رہی تھی اس کا سامنا کیا۔ اگر کیا بھی تو جزواً، کسی ایک پہلو سے، یا اس کی کسی ایک جھلک پر قناعت کر لی۔ بسا اوقات خود اپنی ذات کے مشاہدے سے خائف ہو گئے۔ اس کے امکانات سے گھبرا اُٹھے۔ لیکن انبیاؑ علیہم السّلام نے حقیقت کا سامنا کیا۔ اسے اپنے اصلی روپ میں دیکھا۔ لیکن بے قابو نہیں ہوتے۔ نہ اپنی ذات سے خوف کھایا، نہ کائنات سے۔ کسقدر مختلف ہے انبیا علیہم السّلام کی شخصیت، ان کا قلب اور دل و دماغ صوفیہ کے جذبات و احساسات اور شعور ذات سے۔ انبیا علیہم السلام کی لغت میں نہ حُسن و جمال کی جگہ ہے نہ کیف و سرمستی، نہ ہجر و وصال کی۔ نہ بقا اور فنا کی بحثیں، نہ تجلّی ذات اور عین ذات کی۔ ان کے یہاں احوال ہیں نہ مقامات۔ نبی کا قلب صوفی کا قلب نہیں ہے جس کے لئے استحاذ ذات کا لمحہ سرتاسر سنجی اور ذاتی معاملہ ہے۔ انبیاء علیہم السّلام کے لئے تو اس کے کچھ اور ہی معنی ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا وہ ارشاد جس کا اقبال نے خطبات میں حوالہ دیا ہے آپ کے ذہن میں ہوگا۔ حضرت شیخ نے واقعہ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارگاہ الٰہی سے واپس تشریف لے آئے۔ اگر میرا وہاں گذر ہوتا تو میں ہرگز واپس نہ آتا۔ اقبال کے نزدیک حضرت گنگوہی کے اس ارشاد سے شعور نبوت اور شعور ولایت میں باعتبار نفسیات جو بنیادی فرق ہے اس کی وضاحت نہایت خوبی سے ہو جاتی ہے۔ یہ فرق کیا ہے؟ اقبال نے اس کی وضاحت جس طرح کی ہے اس سے پہلے یہ دیکھ لینا بہتر ہوگا کہ نبوت ہے کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں زمانہ قبل نبوت میں انبیاؑ علیہم السّلام کا گذر بھی مختلف احوال و واردات سے ہوا۔ اصطلاحاً ان احوال و واردات کو روحانی ہی کہا جائے گا۔ گو لفظ روحانی کا استعمال بھی سہولت بیان کے لئے کیا جاتا اور کرنا پڑتا ہے جس سے انبیا علیہم السّلام اور صوفیہ کے احوال و واردات میں تھوڑی سی مشابہت پیدا ہو جاتی بلکہ غلط فہمی کا باعث ہوتی ہے لیکن انبیا علیہم السلام کے یہاں نہ وہ اعمال و اذکار ہیں، نہ مشقتیں اور ریاضتیں جن کا تعلق صوفیہ کی روحانی تربیت اور اکتساب مدارج سے ہے۔ ولایت خود ایک حاصل کرنے کی چیز ہے۔ اس کی نوعیت اکتسابی ہے۔ نبوت برعکس اس کے وہبی ہے۔ اجتبیٰ کا ایک عمل کہ اللہ تعالےٰ جسے چاہے برگزیدہ کرتے ہوئے اس منصب کے لئے چُن لے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں، اس منصب کے لئے کس قسم کی استعداد ضروری ہے۔ جیسی بھی کوئی استعداد ہے اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

اللہ خوب جانتا ہے رسالت کسے دے۔ ۳؎

اللہ جسے چاہتا ہے بطورِ رسُول چُن لیتا ہے

بعثت انبیاء بہرحال ایک امرِ واقعی ہے۔ اور اس کے سامنے ایک مقصد:۔

انسان ایک ہی اُمت ہیں سو اللہ نے انبیا کو بھیجا۔ مبشر اور منذر اور ان کے ساتھ ایک کتاب اُتاری حق کے ساتھ تاکہ لوگوں میں حکم کر سکیں۔ ۵

مجھے لفظ حکم کا کوئی ترجمہ نہیں ملتا۔ حکم وہ عمل بھی ہے جس میں باعتبارِ منطق ہم کسی چیز کو جانچتے۔ اور پھر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ منطق میں اس قسم کے احکام کو تصدیقات بھی کہا جاتا ہے۔ حکم کے معنی شرعی فیصلے کے بھی ہیں۔ وہ بھی دراصل تصدیق ہی کا ایک عمل ہے۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کا۔ یوں اس اصطلاح کی حیثیت دوگونہ ہو جاتی ہے۔ قانونی اور علمی بھی۔ لفظ حکم میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ انبیاء علیہم السلام حکم لے کر آتے ہیں۔ یعنی وہ تصدیقات جو منتہائے علم ہیں۔ اور وہ قانون بھی جو عمل کا معیار ہے، جسے اس کا صورت گر کہیے بہرحال منصب نبوّت پر کسی برگزیدہ ہستی کی سرفرازی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے مگر کیسے؟ قرآن مجید میں جابجا کچھ اشارے سے ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھا چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا مشاہدہ کیا۔ سوچنے لگے اِن آفلین کے مقابلے میں غیر آفل کیا ہے۔ انہیں ملکوت السموات والارض دکھائے گئے۔ وہ منصب نبوّت پر فائز ہو گئے۔ ۶

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ انہیں طرح طرح کی آزمائشیں پیش آئیں جب جا کر منصب نبوّت کے اہل ہوتے۔ ۷

حضرت یحییٰ کو بچپن ہی میں حکم مل گیا۔ ۸ حضرت یونس کی آزمائش بطن ماہی میں ہوتی۔ حضرت رسالتمآبؐ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

علمہ شدید القویٰ ذو مرۃ ۹

تو بناتے تھا تجھے ہدایت دی۔ ۱

میرے لیے حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ان کا اردو ترجمہ ممکن نہیں۔ حاصل ان کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو تعلیم دی گئی ایسی شدید اور گراں بار کہ آپؐ ہی اس کے متحمل ہو سکتے تھے۔ غور فرمایئے انبیا علیہم السلام کا گذر جن احوال و واردات سے ہوا ان میں اور صوفیہ کے احوال و واردات میں کس قدر فرق ہے۔ نبوّت جیسا کہ عرض کر چکا ہوں سرتاسر وہب اور اجتبائی ہے۔ ولایت اکتساب۔ لہٰذا دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے سرتاسر مختلف۔ نبوّت ایک منصب ہے اور اس کے سامنے ایک مقصد جس کے لیے انبیا علیہم السلام کو تیار کیا جاتا ہے۔ ولایتِ حقیقت سے اگر ہمارا رشتہ کٹ نہیں گیا ہے، جس کے انکشاف و اکتشاف کا عمل جاری

ہے اور جاری رہے گا جسے ہم طرح طرح سے تلاش کرتے ہیں اور جو کبھی کبھی خود ہمارے ذہن میں در آتی ہے تعلق اور تقرب کی ایک شکل۔ سراسر نجی اور ذاتی۔ صاحب ولایت کے حالات اور استعداد ذہنی سے مخصوص۔ لہٰذا نہ قطعی نہ آخری۔ یہ تعلق اور تقرب خاصۂ حیات ہے۔ علم کا ایک ذریعہ اور علم ہی کی طرح متحرک، متنوع اور اضافہ پذیر۔ نبوت اور ولایت میں اگرچہ باعتبار اتحادِ واردات ایک قدر مشترک موجود ہے۔ لیکن ان کی نوعیت چونکہ اصلاً جداگانہ ہے اس لئے انبیا اور صوفیہ کے باب میں اتحادِ ذات سے باز آمد میں جو بنیادی فرق ہے اقبال نے خطبہ پنجم میں اس کی وضاحت بڑی خوبی سے کر دی ہے۔ صوفیہ کی باز آمد ایک انفعالی امر ہے، انبیا علیہم السلام کی تخلیقی۔ انبیا اتحادِ ذات کے لمحوں سے واپس آتے ہیں تو اس لئے کہ زمانے کی رو میں داخل ہو جائیں۔ ان قوتوں کو تصرف میں لا کر جو تاریخ کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کر دیں۔ انبیا کے لئے اتحادِ ذات کے معنی ہیں ان کے اندرون وجود میں کچھ اس طرح کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری جن سے دنیائے انسانیت متزلزل ہو جاتی ہے۔ انبیا کی شدت سے خواہش ہوتی ہے کہ وہ روحانی تجربہ اور مشاہدہ جس سے ان کا گذر ہوا ایک عالمگیر قوت کی شکل اختیار کر لے۔ ان کی باز آمد گویا ایک طرح کا عقلی امتحان ہے خود ان کے روحانی مشاہدے کا۔ اس تخلیقی عمل میں وہ نہ صرف اپنے آپ کو جانچتے ہیں بلکہ محسوس حقائق کی اس دنیا کو بھی جس میں ان کا جی چاہتا ہے اپنے ارادے کو خارجاً متشکل دیکھیں۔ پھر جب وہ اس اثر ناپذیر ہیولیٰ میں جو اُن کے سامنے ہوتا ہے نفوذ کر جاتے ہیں تو اس سے ان کی اپنی ذات ہی ان پر منکشف نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے چشم تاریخ پر بھی بے نقاب کر دیتے ہیں۔" آگے چل کر اقبال نے لکھا ہے "انبیا کے ان تجربات اور مشاہدات پر حکم لگانے کا ایک دوسرا طریق یہ بھی ہے کہ ہم دیکھیں ان کے مشاہدہ ذات نے کس طرز کے انسان پیدا کئے۔ علیٰ ہذا القیاس وہ کیا ثقافتی دنیا تھی جس کا ظہور ان کی دعوت سے ہوا۔"

اقبال نے انبیا علیہم السلام کی باز آمد پر جس خوبی سے حکم لگایا ہے اس کا تھوڑا بہت احساس خود صوفیہ کو بھی تھا۔ حضرت شیخ کنگوہی کا ارشاد ہے: "حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلک الافلاک سے واپس آ گئے اس لئے کہ او صاحب لنگر بود" صوفیہ صاحبان لنگر ہی نہیں ہیں۔ منصب نبوت کے اس پہلو کی وضاحت جس کا تعلق عالم انسانی سے ہے حضرت شیخ نے لنگر کی رعایت سے کی ہے۔ یوں صوفیہ کے احوال و واردات اور ان کی باز آمد کے برعکس انبیا علیہم والسلام کی باز آمد سے جہاں ہماری توجہ (۱) عالم تاریخ کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ (۲) تاریخ میں ایک نئی عالمگیر قوت کی کارفرمائی کی طرف۔ (۳) وہاں انبیا علیہم السلام کی شخصیت (۴) ان کے قوائے نفسی (۵) دعوت و عزیمت اور (۶) اپنی ذات سے باہر محسوس حقائق کی دنیا میں انقلاب آفرینی کی طرف بھی۔ پھر جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ان کی دعوت نے کس قسم کے انسان پیدا کئے۔ اس سے تہذیب و ثقافت نے کیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے لئے تاریخ ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ کیونکہ تاریخ بھی ایک سرچشمہ ہے علم اور معیارِ صداقت کا۔

لہٰذا آیئے اس باب میں سب سے پہلے تاریخ کا رُخ کریں۔ مطلب ہے تاریخ نبوت کا۔ سورۂ اعراف ایک لحاظ سے

انبیا علیہم السلام کی تاریخ ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس میں تاریخ نبوت کی طرف مجملاً اشارے کئے گئے ہیں۔ گو پورے طور پر نہیں۔ ابتدا اس تاریخ کی حضرت نوح علیہ السلام سے ہوتی ہے۔ ان کے بعد انبیاؑ علیہم السّلام کا جس طرح یکے بعد دیگرے ظہور ہوا۔ ان کا ذکر آتا ہے۔ مگر اس طرح کہ اس سے نہ صرف بعثتِ انبیا کی سنینی تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے، بلکہ جن انبیا علیہم السلام کا ذکر اس سورۃ میں نہیں آیا ان کی طرف بھی ہمارا ذہن آپ سے آپ منتقل ہو جاتا ہے۔ تاآنکہ تاریخ نبوّت کے فہم میں کوئی مشکل نہیں رہتی۔ حضرت نوح علیہ السّلام کا ظہور آج سے کوئی چھ ہزار برس پہلے ہوا۔ اس وقت جب اس عظیم طوفان کے بعد جو اُن کے نام سے منسوب ہے متمدن دنیا از سرِ نو آباد ہو رہی تھی۔ حضرت نوحؑ سے پہلے متمدّن دنیا گویا شیر خوارگی کے عالم میں تھی۔ لیکن اب اس کے تہذیب و تمدن کا عمل ہر پہلو سے شروع ہو رہا تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ کثرت کی اس دنیا میں جو بظاہر تضاد اور تخالف کی دنیا ہے۔ جس میں شقاق و افتراق ہے۔ تصادم اور تزاحم ہم اپنا رشتہ اس حقیقت سے جوڑیں جو اس کی تہ میں موجود ہے۔ اور جس سے کثرت کی یہ دنیا بالآخر ایک وحدت میں ضم ہو جاتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی دعوت گویا توحید کی دعوت تھی، اور توحید انسان کی اولاً ضرورت، زندگی کا اصل الاصول حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ آئے انہوں نے عاد کو ان کی عسکری طاقت پر متنبہ کیا۔ ان کے جانشین حضرت صالحؑ نے ثمود کو فساد فی الارض سے روکا۔ حضرت شعیبؑ نے جن کا زمانہ حضرت صالحؑ سے مؤخر ہے اہل مدین کی معاشی دست بُرد کی مذمّت فرمائی۔ انسان تنہا زندگی بسر نہیں کرتا، اس کا مل جُل کر رہنا بالفاظِ دیگر معاشرہ ایک امر ناگزیر ہے۔ توحید و رسالت اس کی اساس۔ لیکن عاد و ثمود اور اہلِ مدین توحید و رسالت کو سمجھے نہ اس حقیقت کو کہ دولت اور طاقت کا وجود اگرچہ اپنی جگہ پر ضروری ہے مگر ان کا غلط استعمال فساد فی الارض کا سرچشمہ۔ حضرت نوحؑ نے توحید پر زور دیا۔ حضرت ہود اور حضرت صالح نے دولت اور طاقت کے غلط استعمال سے روکا۔ حضرت شعیب نے فرمایا میں حسب استطاعت اصلاح ارض کے لئے کوشاں رہوں گا اور اس طرح یہ نکتہ سمجھایا کہ اصلاح ارض انفرادی نہیں بلکہ ایک اجتماعی عمل ہے۔

غور فرمایئے یہ کفر و شرک کی مذمّت، یہ جوع الارض، یہ تغلب اور استیلا کے لئے طاقت کے استعمال پر سرزنش یہ ہوسِ دولت میں غضب و استحصال پر احتجاج۔ یہ فساد فی الارض کے مقابلے میں اصلاح ارض کا عزم، یہ انبیاء علیہم السلام کا لب و لہجہ، ان کا اندازِ تبشیر و انذار۔ یہ ان کی دعوت کی سیاسی اجتماعی لہٰذا انقلابی نوعیت۔ شر اور اس کی قوتوں سے عملاً تصادم۔ کیا یہ سبب اس امر کا ثبوت نہیں کہ انبیا علیہم السلام زمانے کی رو میں داخل ہوئے۔ اس کا رُخ بدلا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انبیا علیہم السلام نظریات لے کر نہیں آئے۔ ایک دعوتِ عمل لے کر آئے۔ عالم انسانی کی اصلاح اور تعمیر میں کوشاں رہے۔ وہ انسانیت کے صورت گر ہیں۔ ان کا کام تھا آدم گری۔ ان کی حقیقت پسندی کا ایک پہلو ہے انذار، دوسرا تبشیر کہ زندگی کے لئے ہلاکت بھی ہے عافیت بھی۔ انذار و تبشیر سے ہمارا ذہن مقصدِ ثانی یعنی نزولِ کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اِس حکم کی طرف جس سے مقصود ہے زندگی کا ثبات اس کا حفظ و

صیانت۔ بانگ درا کی ایک چھوٹی سی نظم میں اقبال نے کہا ہے۔

انسان کو ثبات کی طلب ہے دستورِ حیات کی طلب ہے۔

ثبات کا تقاضا ہے دستورِ حیات جس کا کوئی سرچشمہ ہوگا، کوئی اصول، کوئی اساسِ فکر و عمل، کوئی نصب العین جس کے حصول کی جدّوجہد کے کچھ لوازم ہوں گے، کچھ شرائط اور جس کے لئے ہمیں دعوت ابراہیمی کا رُخ کرنا پڑے گا۔ حضرت ابراہیم امام الناس ہیں۔ وحدتِ انسانی کے داعی، ایک عالمگیر معاشرے، نوعِ انسانی کے استحاد و ارتباط اور صلح و امن کے پیامبر۔ دعوتِ ابراہیمی کا آغاز آج سے کوئی چار ہزار برس پہلے ہوا۔ دعوتِ ابراہیمی ان سب تصوّرات اور ادارات کی جامع ہے جو ایک عالمگیر اجتماعِ بشری کی اساس ہیں۔ وہ اس اساس و آئین کو لے کر آئی جو زندگی کے لئے ناگزیر ہے، جس پر فرد کی شخصیت اور معاشرے کا نشوونما موقوف ہے۔ تقدیرِ انسانی بھی ایک ایسے ہی معاشرے کے ظہور سے وابستہ ہے مکاناً دعوتِ ابراہیمی کی ابتدا حرم کعبہ سے ہوئی۔ کوئی بھی دعوت ہو اس کی ابتدا کسی مقام سے ہوتی ہے۔ کعبہ نوعِ انسانی کا قبلہ ہے۔ قیاماً للناس، حفظ نوع کا ضامن۔ دونوں ایکدوسرے کی علامت یوں ایک سے ہمارا ذہن دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کعبہ اس اُمّتِ واحدہ کا مشہور مرکز ہے۔ اس سیاسی اجتماعی رُوحانی اخلاقی اور ثقافتی نصب العین کی علامت جو دعوتِ ابراہیمی کے سامنے ہے اور جس کے لئے انبیا علیہم السّلام ہر اس قوم کو جس میں ان کا ظہور ہوا تیار کرتے رہے۔ تاریخِ عالم کے نقطۂ نظر سے یہ موضوع جس قدر اہم ہے اتنا ہی تفصیل طلب۔ لیکن سردست اس مقالے کی حدود سے باہر۔ دعوتِ ابراہیمی تاریخ نبوّت کا وہ مرحلہ ہے جس میں نوعِ انسانی کی غایت مقصود واضح طور پر اس کے سامنے آگئی اور جس سے ہمارا ذہن قدرتاً اس کے دوسرے مرحلے یعنی دعوتِ موسوی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ دعوتِ موسوی دعوتِ ابراہیمی کی عملاً تکمیل کا ایک جزوی اور وقتی مظہر ہے۔ ایک چھوٹے سے خطّے میں محدود و مگر جیسے نسلی برگزیدگی کے زعم نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے حقیقی نصب العین اور اصل الاصول سے منحرف کر دیا۔ بایں ہمہ یہود کی تاریخ سیاست و اجتماع کی تاریخ ہے، اقتدار و اختیار، قرآن مجید کی اصطلاح میں تمکین فی الارض کی تاریخ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں ہی سے نہیں تاریخ عالم کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت درجہ اہم۔ یہی وجہ ہے کہ اُمّتِ اسلامیہ کو اس کے حوالے سے بار بار تنبیہ کی گئی۔ دعوتِ ابراہیمی کی تکمیل دعوتِ اسلامی سے ہوتی۔ یہ نبوّت کا تیسرا مرحلہ ہے جس سے اس اُمّتِ واحدہ کی شیرازہ بندی بالفاظ دیگر نوعِ انسانی کے اتحاد و ارتباط، یک جہتی یکجائی اور بحیثیت ایک عالمگیر برادری کے مادی اخلاقی سیاسی اجتماعی نشوونما کی ابتدا ہو گئی۔ انذار و تبشیر کا فریضہ پورا ہوا۔ وہ کتاب آ گئی جو حکم کا سرچشمہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں قرآن مجید کی یہ اصطلاحات آپ کے ذہن میں ہوں گی۔ لہٰذا آپ کو یہ کہنے میں تکلف نہیں ہوگا کہ بعثتِ انبیا کے سامنے جو مقصد تھا اسلام نے اس کی تکمیل کر دی۔ لیکن تاریخ نبوت کے اس درجہ اجمالی خاکے سے چند ایک نتائج مرتب ہوتے ہیں جن پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور جس کے بغیر ناممکن ہے شعورِ نبوّت کی اہمیت

اور تمام و کمال نوعیت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔

تعلیقات

۱۔ تجلی ذات کا ذکر کرتے ہوئے شیخ اکبر فرماتے ہیں۔

وما بعد ہذا التجلی الا العدم المحض فلا تطمع ولا تتعب فی ان ترقی من ہذہ الدرجۃ من التجلی الذاتی۔

۲۔ محمد مصطفٰے در قاب قوسین او ادنی رفت و باز گردید۔ واللہ باز نہ گردیم۔

۳۔ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ۔ ۶ (الانعام) ۔ ۲۶

۴۔ اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء ۳ (آل عمران) ۱۷۹

۵۔ کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتب بالحق لیحکم بین الناس
۲ (البقرہ) ۲۱۳

۶۔ وکذالک نری ابراہیم ملکوت السموات والارض۔ ۶ (الانعام) ۷۵

۷۔ فتنک فتونا۔ فلبثت سنین فی اہل مدین ثم جئت علی قدر یموسی۔ ۲۰ (طٰہٰ) ۴۰

۸۔ اتینہ الحکم صبیا ۔۱۹ (مریم) ۔ ۱۲

۹۔ علمہ شدید القوی ذو مرہ فاستوی ۵۳ (النجم) ۵، ۶

۱۰۔ ووجدک ضالا فھدی ۹۳ (الضحٰی) ۷

۱۱۔ ولکل وجھۃ ہو مولیھا ۲ (البقرہ) ۱۴۸

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس ۵ (المائدہ) ۹۷

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا ۲ (البقرہ) ۱۲۵